OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

لیپروسی کیمپ کی اسلامی قرات
Islamic Reading of "Leprosy Camp"

Dr. Rubina Yasmeen
Govt. College Women University, Faisalabad
Dr. Sumaira Shafi
Govt. College University, Faisalabad
Dr. Rabia Sarfraz
Govt. College University, Faisalabad

Abstract

When we feel sympathy for someone, we acknowledge their pain, suffering, or hardships and express care and compassion towards them. Showing sympathy towards others can be a powerful way to connect with people, offer support, and demonstrate empathy. It helps create a sense of understanding and solidarity, letting the person know that they are not alone in their struggles. There are many ways to express sympathy, such as offering help, providing words of comfort and encouragement, offering practical help, or simply being present for someone in their time of need. Small acts of kindness and gestures of support can go a long way in showing that you care and understand what someone is going through. It's important to remember that sympathy should be genuine and respectful. It's about acknowledging and validating someone's

CC BY

emotions without judgment or trying to fix their problems. Each person's experience is unique, and it's essential to approach them with sensitivity and compassion. By expressing sympathy towards others, we can foster stronger connections, promote emotional well-being, and create a more compassionate and supportive society. Accessible and affordable healthcare is crucial for the well-being and productivity of individuals. Adequate healthcare services, preventive care, and support systems are essential to address physical and mental health needs, ensuring a healthier and more resilient society.

Key words: Leprosy, Sympathy, Infected, Treatment, Care, Society

تمہید

انسانیت سے ہمدردی کا درس ہمارا مذہب دیتا ہے۔ انسان کو معاشرتی حیوان اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کے سہارے، مدد اور تعاون کا محتاج ہے۔ اسلام میں لوگوں کے حقوق میں کمزور اور بیمار افراد کے حقوق بھی شامل ہیں۔ بیماروں کی دیکھ بھال اور ان کے لیے طبی امداد فراہم کرنا ان انسانی اقدار اور اصولوں میں سے ایک ہے جن کی پابندی مسلمانوں کو کرنی چاہیے۔ اس میں مریضوں کی صحت، ان کی دیکھ بھال اور طبی امداد کا حق شامل ہے، اور معاشرے یا ریاست کو چاہیے کہ وہ سب کو مناسب صحت کی خدمات فراہم کرے، چاہے ان کی معاشی یا سماجی حیثیت کچھ بھی ہو۔ اسلام میں مسلمانوں کو ان لوگوں کی مدد کرنے کی تاکید کی ہے جو بیمار یا کمزور ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اکرام بیماروں کی دیکھ بھال اور ان کی عیادت کرتے اور مشکل وقت میں ان کی مدد کرتے تھے۔ اسلام میں لوگوں کے حقوق میں بیماروں کے حقوق اور طبی امداد بھی شامل ہے۔ بیماروں کی دیکھ بھال اور ان کی مدد کرنا ان عظیم انسانی اقدار میں سے ایک ہے جس کی قرآن پاک میں بھی تاکید کی گئی ہے اور بیمار پرسی کو نیک اعمال میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح نبی پاک ﷺ نے انسانوں میں اچھے اخلاق والے کو پسند کیا ہے۔

مریض کے حقوق کے چند نمایاں پہلو یہ ہیں:

مریض کی کے لیے چھوٹ

اللہ پاک نے مریضوں کے لیے بہت ہمدردی پیدا کی ہے بیمار کو روزہ، وضو، نماز، جہاد اور دیگر احکام میں آسانیاں فرمائی ہیں۔ اللہ کا فرمان ہے: **وعلی المریض حرج**۔[1] اور مریض پر کوئی تنگی نہیں۔

مریض کی طبی دیکھ بھال

اسلام مریضوں کو ضروری طبی دیکھ بھال فراہم کرنے کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ علاج اور دوا کی تلاش اور مریضوں کی صحت کے لیے فکر جائز اور قابل تحسین ہے۔

مریض سے ہمدردی

اسلام مریضوں کی مدد کرنے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اور معالج اور مریض کے ساتھ آنے والوں کو دیکھ بھال اور ہمدردی میں ہمدردی اور خیر خواہ ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔

مریض کی عیادت

مسلمانوں سے گزارش ہے کہ وہ بیماروں کی عیادت کریں، اور بیماری کے دوران انہیں نفسیاتی اور روحانی مدد فراہم کریں۔

مریض کا عزت اور وقار

اسی طرح مریض کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اکتاہٹ میں اس کی عزت نفس کو مجروح نہ کریں اور اس کی عزت و وقار میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

لپروسی کیمپ کے آئینے میں:

مشرف عالم ذوقی کی ایک طویل نثری نظم "لپروسی کیمپ" ہے۔ یہ نظم 1999ء میں ساشا پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوئی۔ "لپروسی کیمپ" میں "لپروسی" "Leprosy" سے مراد "جذام" یعنی کوڑھ زدہ کے ہیں۔ جذام ایک متعدی یا چھوت کی بیماری ہے جو ایک سے دوسرے انسان کو لگ جاتی ہے۔ اس بیماری میں جسم گلنا شروع ہو جاتا ہے اور انفیکشن سے بچنے کے لیے باقی جسم کو ڈھانپ کے رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انسانی جلد بد نما ہو جاتی ہے اور انسان ذہنی طور پر خوف زدہ رہتا ہے کہ کب یہ ساری جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اس بیماری سے انسانی اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔ جس انسان کو یہ بیماری لگ جاتی تھی اسے شہر سے باہر نکال دیا جاتا تھا اور وہ وہیں تنہائی میں سسک سسک کے ختم ہو جاتا تھا۔ پاکستان میں کراچی میں یہ مرض 1950 کی دہائی میں عروج پر تھا تو کوڑھ زدہ کو شہر سے باہر پھینک دیا جاتا پھر ایسے مریضوں کے لیے شہر سے باہر مخیر حضرات نے رہائش گاہ تعمیر کروادی تھیں۔ لوگ ناک، منہ اور ہاتھ لپیٹ کے ان کو کھانا دینے جاتے اور گھر کی دیوار کے ساتھ کھانا پھینک آتے تھے، وہ مٹی اور کیچڑ سے بھرا ہوا کھانا کھاتے تھے۔ اس مرض کو لا علاج تصور کیا جاتا تھا۔

پاکستانی مدر ٹریسا ڈاکٹر رتھ فاؤ

ڈاکٹر رتھ فاؤ جنھیں پاکستانی مدر ٹریسا کہا جاتا ہے وہ ایک جرمن ڈاکٹر تھیں انھوں نے 1960 میں پاکستان میں کراچی کی سرزمین پر کوڑھ کے مریضوں کی مسیحائی کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی خدمات کی بدولت پاکستان سے اس بیماری کا علاج ممکن ہوا اور اس بیماری کا خاتمہ ہوا۔ انھوں نے اس بیماری کے خاتمہ کے لیے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ان مریضوں کا علاج کیا اور انسانیت کا درس دیا۔ جب کہ وہ جانتی تھیں کہ اس بیماری کا حملہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم کوڑھ زدہ مریضوں کے پاس جاتے ہیں تو یہ جراثیم جسم میں سانس کے ذریعے داخل ہوتا ہے اسی لیے لوگ ایسے مریضوں سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔

مریض کی عیادت اور علاج کروانا انسانی فریضہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت کرنا، جنازے میں شریک ہونا، دعوت کا قبول کرنا اور چھینکنے والے کو دعا دینا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

سبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، أَسْتَغْفِرُاللّٰهَ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ۔[2]

شاعر کی انسان دوستی کی ایک مثال ہے کہ انھوں نے سماج کے ٹھکرائے ہوئے کوڑھ زدہ مریضوں کے لیے قلم اٹھایا ہے جن کا نام لینا بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ اس نظم میں ایک خاموش احتجاج ہے۔ جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ سماجی تناؤ کے خلاف احتجاج سب محسوس تو کرتے ہیں مگر اس مسئلہ پر قلم اٹھانا مشرف عالم ذوقی کا حوصلہ ہے۔ خواجہ میر درد لکھتے ہیں:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں[3]

حقیقت میں جو انسانیت کا درد دل میں رکھتا ہے وہی انسانیت کے منصب پر قائم رہنے کا اہل ہے۔ دکھ تکلیف میں کسی کے کام آنا اور مذہب، قوم اور نسل سے ماورا ہو کر انسانیت کی خدمت کرنا ہی انسانیت کا مقصد ہے۔ انسان انہی خوبیوں کی بنا پر اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔

شاعر نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ 80 کی دہائی میں مجھے معلوم ہوا کہ کوڑھیوں کا ایک قافلہ آرہ'رمنہ میدان کے آس پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ دسمبر کی ٹھنڈک اپنے عروج پر تھی۔ مجھے ان کو دیکھنے کا شوق ہوا۔ میں نے ایک کہانی "لیپروسی کیمپ" لکھی جو افسانوی مجموعہ "منڈی" میں شامل ہے۔ پھر 1984ء میں "لیپروسی کیمپ" کوڑھی نامہ کی طویل نظم تحریر کی۔ انسانوں کے قبیل سے کٹے ہوئے ان لوگوں کو دیکھنا شاعر کا مشغلہ تھا۔ موسم سرما میں جب ان لیپروسیوں کا قافلہ داستانی حویلی کی پتھریلی سڑکوں پر سے گزرتا تو "رنگ والی تھالیوں" کا سنگیت فضا میں گونج اٹھتا تھا۔ اُن کے سر پر "Help Me" کی ٹوپیاں چپکی ہوتیں۔ ان کو دیکھنے سے شاعر کی والدہ انھیں باہر جاتے ہوئے کھینچ کر اندر لے جاتیں۔ مگر ان کی رنگ والی تھالیوں کے سنگیت کا شور اور ان کے آڑھی، ترچھی، ٹیڑھی، سڑی شکلیں ان کے ذہن پر سوار رہتیں۔ یہ منظر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

آنکھیں بند کروں تو اماں۔ تصویریں چھا جاتی ہیں۔۔۔۔
تصویریں ہی تصویریں ہیں، جو خیالوں میں آتی ہیں۔۔۔۔[4]

نثری شاعری کے موجد احمد ہمیش کے نام

مشرف عالم ذوقی نے اس نظم کا انتساب نثری شاعری کے موجد احمد ہمیش کے نام کیا ہے۔ نظم میں زبان کی سادگی، سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ اس نظم کی پڑھتے ہوئے ایک سحر طاری ہو جاتا ہے جو قاری کو مسلسل پڑھنے پر مائل رکھتا ہے۔ تشبیہ اور استعارہ کو بارہا مستعمل کیا گیا ہے جو طوالت میں اکتاہٹ کا تدارک کرتا ہے۔ استعارے کی زبان میں بات کرنے کا انداز بھی احسن ہے۔ صنعتِ تضاد اور تکرار کا بے شمار استعمال شاعر کی پختہ فکر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ صنعتِ مرات النظیر بھی جا بجا

مستعمل ہے۔ کہیں کہیں نظم تغزل کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بھی ایک لائقِ توجہ امر ہے کہ نظم طویل ہونے کے ساتھ ساتھ ندرتِ خیال اور چاشنی سے بھرپور ہے۔ مکالمہ کی تکنیک اور شعور کی رو کی تکنیک نظم کا خاصہ ہے اور بطریقِ احسن ان کو نبھایا گیا ہے۔ اپنی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ذہن پر جب بھی کوئی خیال نازل ہوتا ہے تو وہ پورے 'تام جھام' تکنیک 'اسلوب کے ساتھ جنم لیتا ہے اور لاشعور میں ہی یہ طے ہو چکا ہوتا ہے کہ

الف۔۔۔۔۔۔ اسے ڈرامے کے طور پر لکھنا ہے

ب۔۔۔۔۔۔ اس کے لیے کہانی موزوں ترین چیز ہے

ج۔۔۔۔۔۔ یہ خیال نظم میں در آئے تو بہتر ہے"[5]

مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں کہ میرے لیے اس قافلہ کے احساسات کو بیان کرنا بہت دشوار تھا اس لیے میں نے نثری نظم کا انتخاب کیا۔ آپ نثری نظم کے حوالے سے صفحہ نمبر 17 پر لکھتے ہیں:

"میں نثری ادب کو اسی طرح ادب کا حصہ مانتا ہوں جس طرح افسانہ یا غزل کو۔ کیونکہ نثری نظم کی ادبی حیثیت کا منکر ہونا میرے نزدیک تنگ نظری کی دلیل ہے کسی صحت مند رویے کا ترجمان نہیں۔"[6]

یہ ایک علامتی نظم ہے۔ اس کو مختلف عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے۔ جیسا کہ کوڑھیوں کے نام کچھ اور نظمیں اور کوڑھی نامہ وغیرہ۔ یہ لوگ انسانی آبادیوں کے باہر جنگل میں اپنا خیمہ لگا کر رہتے ہیں اور اس تنہائی میں درد سے چیختے رہتے ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کس کا درد زیادہ ہے۔ ان انسانوں کو تو گدھ بھی کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بقول شاعر:

گدھ بھی نہیں کھاتے تھے انہیں
مگر منڈلاتے تھے ان کے آس پاس

چاروں جانب
شاید ان کے آدمی ہونے کی
تشخیص یا تحقیق کرتے تھے
پھر اُڑ جاتے تھے
پھر واپس نہیں آتے تھے[7]

پھر ختم ہوتی صدی کے ساتھ کہیں غائب ہو گئے۔ وہ اب بھی آتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ گِدھ نہیں ہوتے۔ پہلے ان کے پاؤں میں گھنٹیاں ہوتی تھیں جب گھنٹیاں بجتیں سڑکیں سنسان ہو جاتیں، سب اپنے گھروں میں بند ہو جاتے۔ ان کے پاؤں میں پہلے بیڑیاں ڈالی گئیں۔ انہیں انسانی آبادی کے باہر کی جگہ دے دی گئی۔ وہ بہت ہی بری حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ پہلے آریاؤں کے ساتھ آئے اور کچھ کہتے ہیں۔ محمود غزنوی اپنے قافلے کے ساتھ لایا تھا۔ وہ جس کے ساتھ بھی

آئے ہوں وہ اپنی ایک حقیقت ساتھ لائے کہ دکھ کے ساتھ سکھ، محبت اور نفرت اور خوبصورتی کے ساتھ بدصورتی بھی ہوتی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ میر جعفر کے ساتھ تھے اور فرنگی ان کو سیاست میں استعمال کرتے تھے۔

یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ سے پہلے آئے تھے۔ بیڑیوں کی کہانیاں تو سن چکے ہیں لیکن یہ نہیں پتا وہ عیسیٰؑ سے پہلے آئے تھے یا بہت بعد میں۔ اتنا طے ہوا کہ وہ کہیں سے بھی آئے تھے وہ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔ تب ہم سپنوں کی دنیا میں رہتے تھے جس میں ہر چیز رنگین نظر آتی ہے۔ سپنے میں اپنی جوانی اور بڑھاپا دیکھتے اور سپنے میں حسین لڑکی کے ساتھ بہت دور تک نکل جاتے۔ پھر سپنا ٹوٹا تتلیاں اُڑ گئیں۔ آسمان نما عمارتیں تھیں ان میں لٹکے ہوئے آسیب، چمگادڑیں۔ پھر ایک دن سپنے والی لڑکی بھی اُڑ گئی شہر بھی روٹھ گیا۔ پھر ایک آسیب زدہ شہر نظر آیا جس میں آدمی نہیں کوڑیاں تھیں۔ وہ ایک میدان تھا جس میں بدبوؤں، مچھروں، کیڑے مکوڑوں اور گدلے پانی کا راج تھا۔ وہاں خیمے نصب ہو رہے تھے موٹے کپڑے جو جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے ان آدمیوں کی طرح جن کی سلائی بھی ممکن نہیں تھی۔ وہ اپنے خیموں میں سما گئے پیٹ پوجا کے لیے۔

تب ہمیں ہر شے سپنا نظر آتی تھی
ہم سپنے میں دیکھتے تھے اپنی جوانی
سپنے میں دیکھتے تھے بڑھاپا
سپنے میں دیکھتے تھے ایک حسین لڑکی
اور اُس حسین لڑکی کے ساتھ
ہم سپنے میں دُور دُور
نکل جاتے تھے۔[8]

میرے سپنوں کی دنیا آباد تھی تتلیوں، کوڑیوں کے بغیر مجھے زندگی کا چہرہ کٹا پھٹا نظر آرہا تھا۔ شعور کی دنیا واہونے پر تمہیں دیکھ کر اکثر سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ تمہیں کن ماؤں نے جنا ہے اور پھر چھوڑ دیا اپنے کوڑھ کے ساتھ گلنے سڑنے کے لئے۔ مجھے صبر ایوب کی قسم! مجھے تم سے ہمدردی ضرور ہے مگر میں تمہیں درازیِ عمر کی دعا نہیں دیتا۔

ایک عورت ویرانے میں بیٹھے اپنے شوہر کے لئے کھانا لے جاتی ہے۔ جس کا سارا جسم کوڑھ کے مرض سے گلا ہوا ہے کپڑے اس کے جسم پر پھر رہے ہیں۔

اور فرشتے تب بھی آتے تھے
اور دیکھتے تھے۔۔۔۔
پھر اپنے پروں پر پیغمبر کے صبر کی داستان لے کر
پہنچ جاتے تھے
اس روشن ہیولہ کے پاس

جو ازل سے ہے
جو ابد تک رہے گا[9]

فرشتے پیغمبروں کے صبر کی کہانیاں جا کر اللہ کو سناتے تھے۔ وہ تمہارا امتحان لے رہا ہے اس لیے مصیبت اور بیماری میں گھبرانا نہیں بلکہ اپنے رب کا شکر ادا کرو۔ میں مشرف عالم ذوقی اگر یہ کہوں کہ میں تمہاری نسل کا ہوں تو حیران مت ہونا یہ ب لوگ بھی تمہاری نسل کے ہیں اس لیے میں نے تمہارا درد محسوس کیا ہے۔ آہ پڑوس والے گھر میں آگ لگی ہو اور گھر کے لوگ جلدی میں گھر سے باہر نکلنے کا راستہ بھول گئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ بچپن سے ہم کوڑھ کے جراثیم اپنے ساتھ لائے تھے یہ نجاستیں، راکھ ساتھ لائے تھے لوگ انہیں دیکھ کر اپنے اپنے گھروں میں بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے اپنی چھوٹی معصوم بچی سے ڈر لگتا ہے کہیں یہ ڈر اس کے اندر نہ بس جائے اس نے آگ لگنے کا یہ منظر اپنی ماں کے ساتھ چھپ کر دیکھا اور اپنے اندر بٹھالیا ہے۔ مجھے ڈر ہے وہ اس منظر کو لیے بڑی ہو جائے گی میں یہ کیسے تصور کروں کہ میری بیٹی اس ڈراؤنے منظر کو بھلا دے گی۔

"خارش زدہ کتے اور پسینے کی بو"

"خارش زدہ کتے اور پسینے کی بو" کے عنوان سے شاعر ان تمام مناظر کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ مجھے یاد ہے خارش زدہ کتوں کے جسم سے آنے والی بو اور جلے ہوئے انسانی جسموں کی بو اب بھی لگتا ہے کہ یہ بو میری سانسوں میں بس گئی ہے۔ چیخ وپکار اور ہنگامے کو سن کر سینکڑوں کی تعداد میں کتے جمع ہو گئے اور ان کی بو فضا میں پھیل گئی۔ میری بیوی یہ تماشا دروازے سے چھپ کر دیکھ رہی تھی میری بیٹی خوف سے سہمی ہوئی تھی۔ میں یہ سارے مناظر بھول جاتا مگر میں نہیں بھول سکتا۔ مجھے بچاؤ کی تدبیر کرنی ہے۔ میری بیٹی اب جوان ہو گئی ہے اور تمام مناظر اس کی آنکھوں میں رچ بس گئے ہیں اور دھیرے دھیرے مضبوط جڑیں بناتے جا رہے ہیں۔ مجھے وہ منظر بھول جانا چاہیے میں اکثر سوچتا ہوں میری بیٹی آہستہ آہستہ کھڑکی کے قریب جاتی ہے خوف سے باہر دیکھتی ہے کہ کہیں کوئی خارش زدہ کتا نہ کھڑا ہو۔ جس سے اس کے جسم پہ دھبے پیدا نہ ہو جائیں اور اسے ویرانے میں پھینک دیا جائے جیسا اس کی ماں کے ساتھ ہوا۔ اگر راستے میں کسی خارش زدہ کتے پر نظر پڑ جائے تو میں گھر کی طرف لپکتا ہوں اور اپنی بچی کو وہاں سلامت دیکھ کر ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔ زندگی خوف سے الگ نہیں ہے۔ خوف جو آگ لگنے کے بعد ہوتا ہے۔ تو چند تماشائی جمع ہو گئے صرف دیکھنے کے لیے۔ اور سینکڑوں خارش زدہ کتے جمع ہو گئے۔ میری بیوی یہ دیکھ کر بولنا بھول گئی۔ اسے یہ مردے آنکھوں میں جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ باتیں کرتے، ناشتہ کرتے، قہقہے لگاتے، نوک جھوک کرتے۔ مگر یہ سلسلہ بھی ایک دن بند ہو گیا۔ سب کچھ دفن ہو گیا۔

میری بیوی نے بچی کو تھپکی دے کر سلا رہی تھی کہ اچانک میں دور سے چیخا، اپنی بیوی سے کہا کہ کپڑے بدلو مجھے بدبو آ رہی ہے پسینے کی۔ تو وہ کچھ نہیں بولی۔ مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کے باہر خارش زدہ کتے کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ "کندی، محبت اور خارش زدہ کتے" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ پہلے کبھی میری بیوی رات کو سوتے میں ڈر کر چیختی تھی تو میں ڈانٹ دیتا تھا کہ کیوں ایسا کرتی ہو۔ مگر یہ ڈر اس کے دل میں برسوں سے جمع تھا جب وہ اسکول جاتی تھی اور امّی ابّا کہتے تھے کہ راستے میں کسی سے

کچھ نہیں لینا لوگ بہت خراب ہیں۔ وہ چھوٹے بچوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ یہی ڈر اس کی عمر کے ساتھ بڑا ہو گیا۔ ہاں ایسا ہی ہوا ہو گا۔ میں اپنی بیٹی کے بڑا ہونے کے احساس سے عورت کو مکمل طور پر سمجھ لینے کا یقین کرتا ہوں۔ جب وہ نیند میں اپنی بیٹی کو نہیں پاتی تو خوف سے چیخ پڑتی ہے۔ یہ سارا خوف بچی کو لے کر ہے۔ اس کا چہرا سیاہ پڑ جاتا ہے۔ مگر اس دن اس کی چیخ ویسی نہیں تھی۔ اس نے کندی کی جلی ہوئی لاش دیکھ لی تھی۔ جو جھلسے ہوئے مکان سے باہر لائی جا رہی تھی۔ نیم بے ہوش حالت میں۔

میری بیوی اپنی بیٹی کو لے کر بھینچتی رہی اور دروازہ بند کرنے کو کہتی رہی کہ خارش زدہ کتّے آ جائیں گے۔ میں اکثر سوچوں میں رہتا ہوں کہ مجھے یہاں آرام ملتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کندی میری بیٹی نہیں تھی مگر اس میں میں نے اپنی دو ماہ کی بچی کا عکس دیکھا ہے جو اچانک بڑی ہو گئی ہو، کندی کی طرح۔

اشوک اور وہ بچپن میں کھیلتے تھے مگر اب وہ اشوک سے ملتی نہیں ہے۔ میری بچی کو وہ اُٹھاتی ہے۔ میری روتی ہوئی بچی چپ کر جاتی ہے جیسے اس کی ماں نے اُٹھا لیا ہو۔ کندی ابھی چھوٹی ہے مگر مکمل لڑکی ہے۔ بچی بھی، ماں بھی، محبوبہ بھی۔ میری بیوی سسکتی ہے:

کندی۔۔۔۔ میری کندی۔۔۔۔

نام۔۔۔
لگی ہوئی آگ۔۔۔۔
نام نہیں دیکھتی۔۔۔
رشتہ نہیں پہچانتی۔۔۔۔
بس پھیلتی جاتی ہے۔۔۔۔[10]

"جانے والے کا آخری مکالمہ"

"جانے والے کا آخری مکالمہ" میں شاعر نے لکھا ہے کہ مکالمے انسانی زندگی میں حرارت بھرتے ہیں۔ مگر تمام مکالمے سو گئے ہیں۔ کندی کو ہوش آ گیا ہے۔ مگر وہ بے ہوش کب تھی وہ حقیقت سے آشنا ہے وہ سب جانتی ہے مگر وہ کس کی طرف اشارہ کرے درد کی لہر اس کے جسم میں دوڑتی ہے۔ اشوک اب اس کی طرف توجہ نہیں دیتا وہ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ کندی کے پاس کھڑا ہے دوسری طرف منہ کئے یہ چہرہ کندی کا تو نہیں ہے اسے اپنا ماضی، حال، مستقبل کہیں نہیں دکھائی دیتا کہ وہ گھنٹوں باتیں کرتے شوخیاں چھیڑ چھاڑ وغیرہ مگر اب کندی بھوت بن گئی ہے۔ آگ کے بڑے شعلوں کے بیچ خارش زدہ کتے کھڑے بھونکتے ہیں صرف تماشا دیکھتے ہیں۔ کندی اشوک کا پوچھتی ہے کہاں ہے اشوک! اشوک تو جا چکا ہے کندی کے جلنے کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی جل گئی۔ میں نے غور سے تمہیں دیکھا ہے تم کچھ بھی نہیں ہو سوائے خود غرضی کے گرم گرم گوشت میں دوڑنے والی بجلی کے کاش کے تم نے دیکھا ہوتا اس سولہ سالہ معصوم بچی کو جو تمہیں جاننے کے بعد راکھ بن گئی اور اپنے جسم سے اٹھنے والی ہر کراہ کو پی گئی۔ اسپتال کے باہر ٹکرانے والی چیخ کو دبا گئی۔ بہت سی زندگیوں کی کہانیوں سے قصے بن جاتے ہیں

بھوت کہیں نہیں ہوتے اور محبت کے ان دنوں میں ادا کیا جانے والا مکالمہ کہیں نہیں ہوتا۔ اسپتال کے باہر ابھی ابھی لکھا ہے معصوم سوالوں کی زندگی یہیں معلوم ہو گئی ہے

اور مکالمے
زندگی میں حرارت نہیں بھرتے
بس ایک لمحے کا درد ہوتے ہیں۔۔۔
اور یہ درد رہ کے ٹیس مارتا ہے
رہ رہ کے اٹھتا ہے[11]

جب ایک جلے ہوئے چہرے نے پوچھا میں کیسی لگ رہی ہوں مجھے آئینہ دکھاؤ تو اُف میرے پیر ہاتھ کتنے گھناؤنے ہیں کوڑوں کی طرح غلیظ۔ میں نفرت انگیز ہوں۔

"جبلت"

"جبلت" میں لکھتے ہیں کہ تم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم نے اپنے اندر کتنے جانوروں کو سلار کھا ہے۔ بلی، شیر، چیتے کو سب کو تبدیلی کی الگ الگ غذا فراہم کرتے ہیں۔ سب کی اپنی اپنی فطرت ہے۔ الگ رنگ اندازِ فطرت کو لے کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ بلی معصوم نظر آتی ہے مگر چھیچھڑوں پر نظر ٹکائے نئے منصوبے بناتی ہے۔ اور کتا دروازے کے سامنے ڈالی گئی روٹی دیکھ کر دم ہلا دیتا ہے۔ کتے بھونکتے ہیں، کاٹتے ہیں، رات کے اندھیروں میں انسانی بھیس بدل کر۔ خارش زدہ کتے معاشرے کو، تہذیب کو، اخلاق کو بیمار بنا رہے ہیں۔ اخلاق جو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ اور انجان بنا ہوا تاک لگائے ہوئے چیتا حملہ کے انتظار میں ہے۔ شیر تکا بوٹی کرنے کے لیے پوری طرح سامنے آگیا ہے۔

اب ان جانوروں کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ ہم نے اپنے اندر سلا لیا ہے۔ کتنے ہی ایسے جانوروں کو۔ اور یہ تمام جانور مناسب کے وقت کے انتظار میں اپنے پنجے تیز کرتے ہیں۔ میری بیوی سوگئی کندی سوگئی اور میری بیٹی وراثت میں ملی ہوئی وحشت کو لیے ہوئے بڑی ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا احساس دیکھتا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہر لڑکی کندی بنتی جا رہی ہے اور ہر عورت پسینہ دیکھ کر چیخ پڑتی ہے۔ مجھے پسینے کے بارے میں کچھ نہیں بولنا وہ جوان اور بوڑھے کا فرق بھول جائیں گے۔ خارش زدہ کتے دن بدن اتنے پھیل جائیں گے کہ مل کر ہمارے گھروں پر حملہ کر دیں گے۔ اپنی بچی پر جھپٹنے سے پہلے ہی میں نے چمٹا تان دیا ہے۔ اس خارش زدہ کتے پر۔ میں نے سکون کا سانس لیا ہے۔ یہ کتا ڈر سکتا ہے بھاگ سکتا ہے۔ یہ صرف ہماری کمزوری کا فائدہ اُٹھاتا ہے۔

ہم اگر مل کر اس کا مقابلہ کریں تو یہ ڈر کر بھاگ جائے گا۔

صبر ایوب کا حوالہ

صبر ایوب کی گھٹاؤں سے جنم لینے والو! میں تمہیں کیوں لکھ رہا ہوں، کیوں سوچ رہا ہوں۔ حضرت ایوبؑ کو بہت سی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی زبان پر کبھی شکوہ نہیں آیا تھا۔ **وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (83)**[12] اور ایوبؑ نے جب اپنے رب کو پکارا کہ مجھے روگ لگ گیا ہے حالانکہ تو تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم ہے۔ دنیاوی تکالیف، رنج و پریشانی میں صبر کی مثال حضرت ایوبؑ سے اللہ پاک بہت راضی ہوئے اور ان کے صبر اور دعا کی بدولت ان کو دوبارہ اپنے پیارے رشتے عطا کیے۔ اللہ کو عجز و انکساری پسند ہے۔

مجھے تمہاری تصویر نظر آ گئی ہے اور شاید ہم ڈر گئے ہیں۔ ہم نئی صدی میں نئے وہم، وسوسے، اندیشے، تباہ کاریوں، میزائلوں کے خوف، جنگِ عظیم کی داستانوں اور کوڑھ کے جراثیموں کے ساتھ نہیں جائیں گے۔ ہم اپنے کھوئے ہوئے جذبات، احساسات، قہقہوں کے ساتھ اپنی بیوی بچوں اور ان پرانی یادوں کے ساتھ باہر نکلیں گے، نئی دنیا بسائیں گے۔ کشادہ دل اور نئے جذبات کے ساتھ ہم چاندنی راتوں میں دل کی باتیں کریں گے اور ان باتوں کے لیے چھت کا انتخاب کریں گے۔ ہم ستارے دیکھیں گے ہم رات ہونے کا احساس کریں گے۔ اور اچانک ہم خوشی کے مارے ہنس دیں گے اور اپنے زندہ ہونے کا خود کو احساس دلائیں گے اور ہم پرانی باتیں بھول کر نئی دنیا بسائیں گے۔ اور کبھی بھی کسی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کریں گے۔

خلاصۂ بحث

اس نظم میں شاعر دنیاوی پریشانیوں، مصیبتوں، آزمائشوں اور بیماریوں سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے وہ پرانی یادیں اور باتیں بھولنا کے نئی امنگوں کے سنگ جینا چاہتے ہیں۔ نئے ولولے اور نئے جوش و جذبے سے اپنی حسرتوں کی تکمیل کتنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو بھی یہ پسند ہے کہ بیماری، تکلیف یا آزمائش میں اسی سے التجا کریں اور رحم اور مغفرت کی دعا کریں۔

References

[1] Al-Noor 24:61.

[2] Muslim Ibn Ḥajjāj Naishapuri, *Al-Masnad al-Ṣaḥīḥ* (Beirūt: Dār 'Ihya al-Turāt al-'Arabī, 1374 AH), Hadith no. 484.

[3] Mīr Dard Dehlvī, *Dewān-e-Dard* (Lahore: Majlis-e-Taraqqī-e-Adab, 2nd Edition, 1988), 177.

[4] Musharraf Ālam Zouqi, *Leprosy Camp* (Dehli: Sasha Publications, 2000), 12.

[5] Zouqi, *Leprosy Camp*, 14.

[6] Zouqi, *Leprosy Camp*, 17.

[7] Zouqi, *Leprosy Camp*, 29.

[8] Zouqi, *Leprosy Camp*, 46.

[9] Zouqi, *Leprosy Camp*, 53.

[10] Zouqi, *Leprosy Camp*, 74.

[11] Zouqi, *Leprosy Camp*, 11.

[12] Al-Ambiyā 21:83.